سے دوچار ہونا پڑا۔ عجمی اقوام کا مزاج عربی نہ تھا اور نہ ان کا تمدّن عربی تھا۔ جس طرح طلوع اسلام کے ابدی حقائق کی آمیزش عربی مزاج سے ہوئی اور ایک مخصوص قسم کا مرکب ظہور میں آیا اسی طرح شام میں، مصر میں، ایران میں، چین میں، ہندوستان میں اور بے شمار دیگر ممالک میں اس نے وہاں کے حالات اور مزاج میں اپنے آپ کو سمویا تو ہر جگہ مسلمانوں کی زندگی میں اسلام کے کلّی حقائق کے ساتھ دیگر اقوام کے عادات واطوار اور میلانات کی آمیزش ہوتی چلی گئی۔ اس آمیزش میں کچھ عناصر صالح تھے اور کچھ غیر صالح۔ بعض جگہ نتائج اچھے نکلے اور بقول علامہ اقبال عرب کے سوزِ دروں نے عجم کے حسنِ طبیعت کے ساتھ مل کر انسانی اقدار کو جدید اور دل کش انداز میں جلوہ گر کیا۔ حافظ اور سعدی، رومی اور عطار اور سنائی اور بے شمار حکماء اور ادیب ایسے ہیں جو ان افکار، ان حالات اور میلانات کی بدولت پیدا ہوئے جو حجاز میں نہ تب موجود ہو سکتے تھے اور نہ اب پائے جاتے ہیں۔

ہم تہذیب اور تمدّن یعنی کلچر اور سویلیزیشن پر پہلے الگ الگ نظر ڈالتے ہیں اور اس کے بعد دیکھیں گے کہ ان کا باہمی تعلق کس قسم کا ہے۔ کیا ایک کی ترقی سے دوسرے کی ترقی لازم آتی ہے۔ کیا ایک کا دوسرے کے بغیر وجود ممکن ہے، یا ایک کی ترقی دوسرے کے منافی ہے۔ پہلے اس سوال کے جواب کی کوشش کرنی چاہیئے کہ تہذیب سے کیا مراد ہے۔ اور مہذّب انسان کسے کہتے ہیں۔ اس سوال کے ساتھ یہ سوال بھی اُبھرتا ہے کہ کیا مختلف ادوار اور مختلف اقوام کی تہذیبیں الگ الگ ہوتی ہیں یا تہذیب انسانی کا فقط ایک واحد نصب العین ہے۔ اور مختلف اقوام کے درجۂ حیات کا اس سے اندازہ کرنا چاہیئے کہ کوئی قوم کس قدر اس نصب العین سے نزدیک یا دور ہے۔ اور جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اس تمام مبحث میں دینی عقائد کو بھی علیحدہ نہیں کر سکتے کیونکہ مختلف تہذیبیں مختلف ادیان کی پیدا وار ہیں، یا دینی عناصر ان میں اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ ان کا الگ کرنا دُشوار ہے۔ اس امر پر اکثر مفکّرین متفق ہیں کہ تہذیب ایک نفسی میلان ہے اور زندگی کے اساسی اقدار کو متحقق کرنے کی کوشش سے تہذیب پیدا ہوتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ تہذیب انہی دو عناصر سے مرکّب ہے جو شہد کی مکھی کے چھتے میں پائے جاتے ہیں۔ اس چھتے میں موم بھی ہوتی ہے اور شہد بھی۔ موم کی بتی سے نور پیدا ہوتا ہے اور شہد سے شیرینی۔ کسی قوم کی تہذیب کو بس اس سے جانچنا چاہیئے کہ اس میں کس قدر عملی اور روحانی تنویر ہے۔ اور زندگی کی تلخیوں کے مقابلے میں اس نے کس قدر شیرینی پیدا کی ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ شیرینی کس طرح پیدا ہوتی ہے تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ وہ ذوقِ حسن سے اور جذبۂ محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ علامہ اقبال بھی فرما گئے ہیں کہ بیابانِ طلب میں ذوقِ جمال ہمارا رہبر ہے۔ جہاں زندگی کا انداز اس قسم کا ہے کہ اس میں جمال آفرینی کا فقدان نظر آتا ہے،

وہاں تہذیب نہیں ہے۔ اور جہاں انسانوں میں باہمی ہمدردی کا جذبہ کم ہے اور نفسانفسی زیادہ، جہاں جابر مجبور و معذور پر بے کھٹکے ظلم کرتا ہے اور پھر بھی جماعت میں معزز شمار ہوتا ہے، وہاں تہذیب نہیں ہے۔ انسانی زندگی کا نصب العین جہل اور ظلم سے نجات حاصل کرنا ہے۔ جہل سے نجات علم کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اور ظلم سے نجات محبت اور ہمدردی کی گہرائی اور اس کی توسیع سے۔ جہل اور ظلم سے نجات حقیقی نجات ہے جو انسان کو "لاخوف علیھم ولاھم یحزنون" کی معراج تک لے جاتی ہے۔ مختلف افراد مختلف میلانات لے کر پیدا ہوئے ہیں :

ہر کسے را بہر کارے ساختند میل وے اندر دلش انداختند

حدیث شریف میں ہے "فکلٌ میسر لما خُلق لہ" یعنی جو شخص جس انداز زندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس کا حصول اس کے لئے آسان ہوتا ہے۔ میلانِ طبع کی وجہ سے اس کو وہ بات سہل معلوم ہوتی ہے جو دوسروں کو دشوار دکھائی دے۔ اچھی تہذیبیں وہ ہیں جن میں ہر فرد کو اپنے میلانات اور ممکنات کو معرضِ وجود میں لانے کے لئے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ کوئی انسان دوسرے انسان کا غلام نہ ہو۔ اور حصولِ علم اور حصولِ کمال کے راستے میں کوئی قوت اس کی مزاحم نہ ہو۔ وہ اپنے فکر میں بھی آزاد ہو اور اپنے عمل میں بھی جہاں تک کہ اس کا عمل دوسروں کی جائز آزادی کے منافی نہ ہو۔ حصولِ کمال کے لئے ضبطِ نفس کی بھی ضرورت ہے اور تسخیرِ فطرت کی بھی۔ کیونکہ فطرت کا جبر جہالت کی وجہ سے انسان کو بے بس بنا کر اس کی قوتوں کو مفلوج کر دیتا ہے۔ گویا تمام تہذیب کا مدار مکارمِ اخلاق پر ہے۔ بگڑے ہوئے اخلاق پر تہذیب کی کوئی پائدار تعمیر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ یک طرفہ علمی ترقی جو اخلاقی اقدار سے معرا ہو وہ مفید ہونے کی بجائے بے حد مضر اور مہلک ہو سکتی ہے۔ اس کو عارف رومی نے ان دو اشعار میں بیان کر دیا ہے :

علم را بر تن زنی مارے شود علم را بر جاں زنی یارے شود

سامانِ حیات کی فراوانی کے لئے فقط زیرکی میں اضافہ کرتے چلے جانا اور توسیعِ محبت کی کوئی کوشش نہ کرنا انسان کے لئے محض ابلیسانہ میلانات پیدا کرتا ہے :

می شناسد ہر کہ از سرِ محرم است زیرکی از ابلیس و عشق از آدم است

تہذیب کے اس نصب العین کو ایک مسلمان دین بھی کہہ سکتا ہے۔ انفس و آفاق کے علم و معرفتِ حقائق کی لامتناہی کوشش کی تلقین قرآن میں بالتکرار ملتی ہے اور خدا جو انسان کا انتہائی نصب العین ہے اس کی وہ صفت جو کائنات کے ہر پہلو پر حاوی ہے رحمت ہے۔ اور انسان سے بھی خدا اس کا متقاضی ہے کہ

وہ "تخلقوا باخلاق اللہ" کی کوشش میں اس صفت کو زیادہ سے زیادہ اپنائے۔ لیکن چونکہ محبت کا جذبہ بے علمی کی وجہ سے بھٹک بھی سکتا ہے اور محبت اندھی بھی ہو سکتی ہے اس لئے محبت کو علم کی تنویر کی بھی ضرورت ہے۔ محبت اور معرفت ایک دوسرے کے معاون بھی ہیں اور ایک دوسری کی علت بھی۔ اور ایک دوسری کی معلول بھی۔ افلاطون نے اقدارِ حیات کا جائزہ لے کر یہ فیصلہ کیا کہ زندگی کے تین اساسی اقدار ہیں۔ (۱) حق (TRUTH)۔ (۲) حسن (BEAUTY)۔ (۳) خیر (GOODNESS) یا بالفاظِ دیگر صداقت، جمال اور نیکی۔ اس تثلیث میں ایک وحدت بھی ہے۔ سچائی بھی حسین معلوم ہوتی ہے اور حسن کے اندر بھی صداقت موجود ہے۔ اسی طرح صداقت نیکی کی طرف رہبری کرتی ہے اور نیکی سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ تینوں ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ حسن آئینۂ حق اور حق آئینۂ حسن۔ اسی طرح حق اور حسن خیر ہیں اور خیر میں صداقت بھی ہے اور حُسن بھی۔ تہذیب کا معیار انہیں اقدار سے متعین ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم ایسی ہے جس میں حق جوئی اور حق پژوہی نہیں۔ یا اس کے افراد میں ذوقِ جمال کی کمی ہے، جو نہ زندگی میں زینتیں پیدا کرتے ہیں اور نہ ان سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ یا جو ملّت علم اور حسن آفرینی کی یک طرفہ اور محدود کوششوں میں محبت کے فقدان کی وجہ سے خیر طلب نہیں، تو سمجھ لیجئے کہ وہاں تہذیب نہیں ہے۔ ایسی تہذیب بقول علامہ اقبال جھوٹے نگوں کی چمک دمک اور ریزہ کاری ہے اور اس کے متعلق یہ خطرہ ہے کہ علم نے جو بے پناہ قوت اس کو عطا کی ہے اس کے غلط استعمال سے وہ اپنے ہی جگر میں خنجر بھونک کر خودکشی کر لے۔ مغربی تہذیب کا انجام اگر وہ عشق سے معرا رہی، اقبال کو یہی دکھائی دیا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

مغرب کی جغرافیائی اور نسلی قوم پرستی نے، اپنی تمام مادی ترقیوں کے باوجود، ہمارے سامنے دو خوفناک جنگوں میں جہنّم کا نمونہ پیش کیا۔ یورپ کی ہر قوم دو صدیوں کی تسخیرِ فطرت کے نشے میں، اس اندازِ حیات میں ترقی کرتے ہوئے، عیش دوام کے خواب دیکھ رہی تھی کہ یک بیک ان کی بے اخلاق سیاست نے ان کے پرخچے اُڑا دیئے:

دیکھ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام

اسی لئے امریکہ کے روحانی مصنّف ایمرسن نے بجا کہا ہے کہ اس قسم کی قوم پرستی کلچر کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اور تہذیب اسی وقت قائم اور استوار ہوگی جب انسانوں کو اس طاغوت کی پرستش سے چھٹکارا حاصل ہوگا۔ حقیقی تہذیب توحیدِ انسانیت کے جذبے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر انسان

قوم ونسل ورنگ وزبان اور رسوم ورواج کے اختلاف کو باہمی خصومت کا سبب بنائے رکھیں تو انسان نہ دینی لحاظ سے موحد ہو سکتے ہیں اور نہ انسانوں کے روابط میں وحدت آفرینی کر سکتے ہیں۔ مرزا غالب بھی اس بارے میں ایمرسن کے ہم نوا ہو کر کہتے ہیں کہ جذبۂ قومیت کی کمی ایمان کی فراوانی کا باعث ہوتی ہے:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اس کے بعد ہم تمدّن یا سویلیزیشن کی طرف آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کے تضمن میں کیا کچھ آتا ہے۔ تمدّن کے لفظ کا مادہ بھی مدن یا شہریّت ہے اور سویلیزیشن کا مادہ بھی لاطینی میں سویٹاس یا شہر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تمدن حقیقت میں وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں لوگ شہروں میں رہنے لگتے ہیں۔ شہری زندگی میں مختلف پیشے ہوتے ہیں اور تقسیم کار سے ہر کام اور ہر فن کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔ روابط کی گوناگونی کچھ لذّتیں اور کچھ پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے۔ رسوم ورواج ترقی کرتے کرتے منضبط قوانین کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ دولت اور سامانِ حیات میں افزونی ہوتی ہے۔ حرص وہوس ترقی کرتی ہے۔ جبر وتعدی سے حصول مال اور حصول اقتدار کا جذبہ نمایاں ہوتا ہے۔ علوم وفنون کی ترقی سے زینت کے سامان مہیا ہوتے ہیں۔ انسانی عقل بھی مدنیت ہی سے ترقی پاتی ہے۔ زندگی کی اُلجھنوں کو سلجھانے کے لئے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر جب ایک مختصر طبقہ دوسروں کی محنت کی بدولت فکرِ روزگار سے آزاد اور فارغ البال ہوتا ہے تو ایسے مسائل کی طرف بھی توجہ کرتا ہے جن کا براہِ راست زندگی کی مادی ضرورتوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ علم محض مادّی افادیت سے شروع ہو کر آخر میں ایک حد تک آپ ہی اپنا مقصود بن جاتا ہے۔ لیکن وہ افادیت سے مطلقاً بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ زندگی کی مادّی اور جسمانی آسائشوں اور آرائشوں کے لئے بھی قوانینِ فطرت کو سمجھنے اور ان کو مسخر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ عقل انسانی روابط کے متعلق ہو یا فلک پیمائی کرے، شہری زندگی ہی کی پیداوار ہے۔ اس لئے مولانا روم فرماتے ہیں کہ گاؤں میں رہائش اختیار نہ کرنا ورنہ مدنیت سے بے تعلق ہو کر احمق ہو جاؤ گے:

دِہ مَرو دِہ مرد را احمق کنند

افلاطون کے ایک مکالمے میں ایک شخص سقراط سے پوچھتا ہے کہ تم ہمیشہ شہر ہی میں رہتے ہو باہر کیوں نہیں جاتے۔ اس نے جواب دیا کہ میں جس عقل کو ضروری سمجھتا ہوں وہ کھیتوں میں نہیں اُگتی۔ اور نہ درختوں پر لگتی ہے۔ فقط شہری زندگی کے روابط سے انسان کی فطرت کا علم حاصل ہوتا ہے اور انسان کے لئے ضروری علم اس کی اپنی فطرت ہی کا علم ہے۔ نہ کہ شجر وحجر کا علم۔